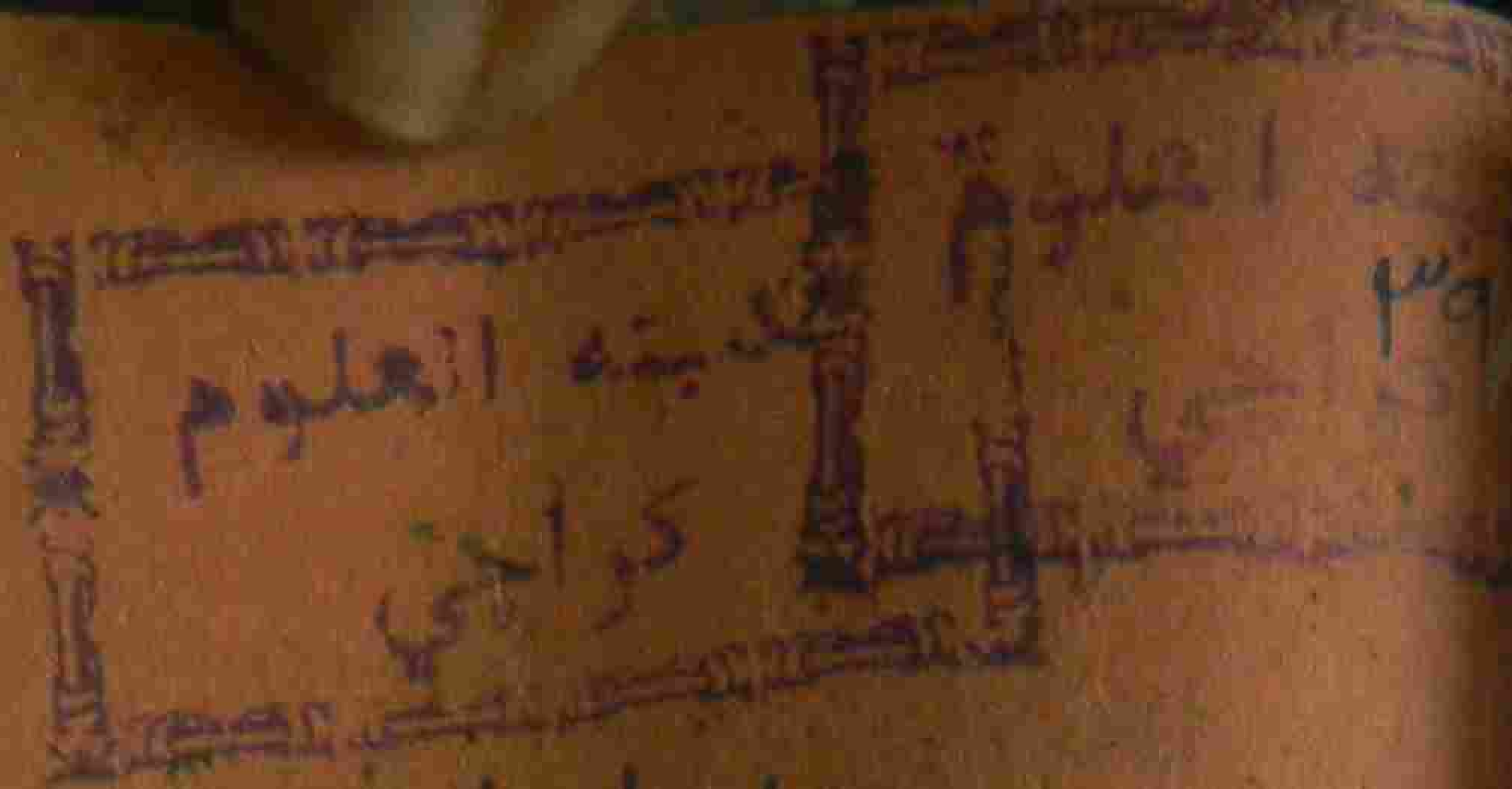


دِلّی کی آخری شمع



مرزا فرحت اللہ بیگ

نگار اکیڈمی کراچی
پاکستان

قیمت عہ

سنہ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن — تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم انسان "ایک محشرِ خیال ہے" لیکن خیال میں حشر بپا کرنے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے۔ مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیال الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اتفاق دیکھئے پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف اُن کی چلتی پھرتی تصویر ہی دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش کر دیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زبانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

نگار اکیڈمی رتن تلاب گوالی لائن نے رئیس پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے — جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعے کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اس کے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہ رہی تھی دریائے جمنا کی چمکیلی ریت دہلی والوں کے لئے نظر فریب رہی اور اس اجڑے دیار میں شعرا ہی نہیں بلکہ ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے۔ زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن میں بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے جو بچے کچھے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا جس کو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رام پور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو وہاں رہ گئے ہیں وہ چیخنے چلانے کو تنہا اب بیٹھے ہیں بہت سے اٹھ گئے بہت سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کہاں تھے جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر مجھے خیال آیا اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی کہ اردو کے لئے ان سے ایک ایسا چراغ تو روشن کر لوں کہ جس کی روشنی میں

آنے والی نسلیں زبان اردو زبان کے محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ ہوں)، دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھنا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کئے جائیں۔ اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی وجہ سے وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔ یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں بہت سے اپنے مرقع پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں۔ لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے مقابلہ میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔ اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے تذکرۂ شاعری

خیال ڈالا ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقہ چہارم نے رجب سنہ ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں ملکوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی کی تکمیل ہیں خود کئے دیتا ہوں۔ البتہ اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا بحیثیت مورخ سنہ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا۔ گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام ہفتصد ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا۔ اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا یہ ضروری ہے کہ انکی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اسکا اندازہ قارئین کرام کر سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دیجائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کر لی تھی۔ مگر نباہ نہ سکے جوان سے نہ ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان خفتگان خاک کا کوئی ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو"

لیجئے میں اب مولوی کریم الدین صاحب کی جوان میں حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت کریم الدین صاحب کی نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہئے۔ مولوی صاحب کو کہئے اور خوب دل بھر کر کہئے۔ میں خوش۔ اور میرا خدا خوش۔ والسلام۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۵۳ کوس بجانب شمال مغرب واقع ہے۔ اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا۔ لیکن زمانے کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے جائداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کیلئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم مصداق عصمت بی بی از بے چادری "متوکل" بنے رہے۔ اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں ۱۲۴۳ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم ان ہی دونوں بزرگوں کے ہاتھ ہوئی لیکن بچپن طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑا دیا۔ اس زمانے میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ "ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ کر دہلی آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارہ کرتا تھا۔ محنت و مزدوری کے بعد ذوق علم ہر حلقہ درس میں لیے پھرتا تھا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی۔ طالب علموں کی تلاش تھی میں بھی ۱۰ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لئے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارے کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لئے

چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا تھا جس کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہئے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کر کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام طبع کر دوں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا۔ اور نہ اب ہے بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ شیوہ نہیں ہے وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں۔ اپنا دل بہلانے اور حسرت نکالنے کیلئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں۔ میرے باپ دادا عالم تھے بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو منہ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف پر نظر پڑی ان سے دو چار دفعہ سابقہ ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے گوری رنگت اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں البتہ داڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے ٹھوڑی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے بہرحال ان کی محبت۔ ان کی شرافت اور سب سے زیادہ ان کے رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی

امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل ان کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں حکیم صاحب کا مکان سرکی والاں میں تھا۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ انہوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے۔ صحن میں نہر ہے۔ سامنے چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان۔ مکان خوب آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے ہیں میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی کہنے لگے مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے۔ بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔ کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کے کہا میاں کریم الدین تم کو بات تو اچھی سوجھی ہے مگر اس کا نباہنا مشکل ہے تمہیں خبر نہیں دلی کے پہلے شاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی اچھا تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتا ہوں ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے ہاں ٹھہرو حکیم صاحب کو آنے دو ایک تجویز سمجھ میں آتی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری خواہش پوری ہو جائے گی۔ اور تمہارا بھی کام نکل جائے گا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم صاحب نکل آئے گورے چٹے آدمی ہیں۔ سفید بھری ہوئی داڑھی گول چہرہ اس میں کچھ کچھ چیچک

کے واغ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں آداب بجالایا میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا آپ کی تعریف کیجئے انہوں نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں خود شاعر نہیں۔ مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا تذکرہ لکھیں اور اس میں ان کے حلیئے اور ان کے کلام کے نمونے دکھائیں مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اب اپنے آخری وقت میں چاہتا ہوں کہ پرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو انشاء اللہ طبیعت خود مرض پر غالب آجائیگی اور تمہیں مرض ہی کیا ہے وہم ہی وہم ہے مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ نواب صاحب نے کہا "حکیم صاحب اور کچھ نہیں اتنا کرو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو، میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی۔ میں ان کو بہت کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا مشکل کام نہیں ہے اور اگر بد قسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرہ کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرہ کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا "عارف تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں اس لئے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس شغل میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں۔ ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم

مرزا فتح الملک[5] بہادر سے ملا دیتا ہوں ان کو آج مشاعرہ کی لوگی ہوئی ہے حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ ٹال گئے۔ اگر ان صاحب نے ذرا زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلی میں آ جائیے میں چوبدار سے کہہ جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دے گا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ کل یہ صاحب حویلی[6] میں ایک بجے آئیں گے۔ ان کو سیدھا بیٹھک میں پہنچا دینا یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا

دوسرے روز ایک بجے کے قریب نوابانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن شملہ باندھ قلعہ معلی پہنچا۔ لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا۔ دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے اجی مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے جہاں پناہ سے میں اجازت لے لیتا ہوں

---

[5] ان کا نام مرزا فخرالدین خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی سنہ ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے ہوئے ۱۲۔

[6] قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے حافظ عبدالرحمٰن احسان کا شعر ہے کہ۔

میری تنخواہ لوٹی مسان لٹیروں نے حویلی میں
بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آسکیں۔ خیر بیٹھیے، شاید ابھی آپ کی یاد ہو
میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا وہ کریم الدین کون صاحب ہیں ان کو
حضور والا یاد فرماتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے
پاس جاکر معاملے ہو جائے گا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہوگی اور یاد بھی ایسے
وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہیں سمایا ہوگا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ اٹھا اور
چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا آنکھ اٹھاکر یہ بھی نہ دیکھا
کہ یہ بندہ خدا کدھر لیے جا رہا ہے۔ اندر سے حضور دیکھنے کا مدت سے شوق تھا اب جو موقع ملا
تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی چلتے چلتے آندھا آگئی۔ آخر خدا خدا کرکے
چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جاکر کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع
دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے
دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے۔ وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا
معنی اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں
ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا
کے رخ پر ہے۔ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے
اندر نہر بہتی ہے بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوارے چلتے ہیں حمام
کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے
کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچے کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں
ٹپک رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا
ہی نازیبا ہے۔ دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی

اور چوبدار نے آ کر کہا کہ چلئے۔ اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں
کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔
چوبدار نے آواز دی ادب سے نگاہ روبرو حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجا لاؤ
میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔
دہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا۔ اور نذر گزرانی نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی
ہوئی، تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے
پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے۔ جس نے حضرت
ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن
آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی لمبی گردن، چوکا ذرا اونچا۔ پتلی۔
ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا چھدری ڈاڑھی کلوں پر بہت
کم، ٹھوڑی پر زیادہ، لبیں کتری ہوئی، ۸۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھک
ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اکا دکا سیاہ بال تھا چہرے پر جھریاں تھیں
لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کراراپن تھا سبز کمخواب کا ایک
بر کا پاجامہ اور ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی
خفتان اور کارچوبی چوگوشہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ ابا رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی
تصویر تھے۔ ۳۲-۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا۔ تو بس یہی کہ وہ بڈھے، یہ جوان۔ ان کا
رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ ان کی
ڈاڑھی سفید تھی۔ ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں
اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے

فرمایا "اماں[1]! تمہارا ہی نام کریم الدین ہے تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو" میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے فرمایا "اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کر دوں۔ مگر کیا کروں زمانے کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا۔ بلنتی فیض پار سامنے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "کڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تو مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے

---

[1] قلعہ دہلی کے دور آخر میں شاہان دہلی بعض وقت مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے چنانچہ اس طرز کلام کی جھلک ابتک حیدرآباد میں پائی جاتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقہ مخاطبت کی بنا پر قلعہ معلی کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "بادشاہ" کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب۔ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ورنہ ان کو پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو اماں ہی کہہ جاتے ہیں۔ ۱۲ (اڈیٹر رسالہ اردو)

استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں۔ مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑ مریں گے اور تم جانتے ہو اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا۔ کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا" میں نے عرض کی قبلہ عالم! میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمہ لیا ہے" فرمایا "تو مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا تو نہیں آ سکتے۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا۔ اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے۔" طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی اے ہے یہ انا بچہ کو بے طرح سلا گئی ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی! یہ خود بخود "فال گوش" مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر میں ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے" لینا ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی تاریخ۔" فرمایا" ۱۴۔ رجب مقرر کر دو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہو گی۔ آج پانچ تاریخ ہے۔ نو دن باقی ہیں۔۔ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ ۲۰ جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوشی خوشی الٹے قدموں واپس ہوا مرزا فخرو

بیچ میں کچھ نہیں بولے۔ مگر یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں خلوت شاہی سچ ہے "بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنا مشکل کام نہ تھا جتنا یہ الٹے پاؤں واپس ہونا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگتی تھی۔ اس لیے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ دیوار سے ٹکر کھائی اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہ جانے پاؤں جا پڑا۔ آخیر بہ ہزار دقت باہر نکل آیا ادھر چوبدار ساتھ ہوا اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے۔ مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لیے بے چین ہو رہے تھے ان ہی کی یہ کار گزاری ہے۔ ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی ہی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے جا کر کہہ دو۔ وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کئے کہنے لگے کہ چلو یہ مشکل تو آسان ہو گئی اب تم یہ کام کر دو کہ کل کم سے کم استاد ذوق۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں۔ اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھنا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ امید ہے کہ میرا نام سنکر راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالہ کر دو مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا

میں نے کہا اور میں کہاں جاؤں فرمانے لگے۔ میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لئے آجاؤ تم کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو ان ہی کے رہنے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہو گا۔ دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔ میں نے کہا مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کون سا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سو سوا سو روپیے اُٹھ جائیں گے یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے" یہ سنکر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں نے کہا۔ نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔ فرمانے لگے۔ بھئی تم اس طرح کے جھگڑے میں نہ پڑو خدا یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں۔ رات کم سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو۔ ذرا آرام کر لو اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ اُدھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ اور خود میرے ہاں چلے آنا اس میں شرم کی کونسی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا مطبع کو بند کرنے کرا اور سامان سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی۔ صبح کو اُٹھ کر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کر دوں۔ کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ مکان بہت چھوٹا ہے۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی

اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے
ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اسکے
کے بعد راستہ چلنے کیلئے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔
اوپر ایک کمرہ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد
صحن میں بان کی کھری چارپائی پہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے
چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں۔ اور ان ہی سے
ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں
متوسط اندام ہیں رنگ اچھا سانولا ہے چہرے پہ چیچک کے داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی
بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں چہرے کا نقشہ کھڑا ہے اس وقت سفید تنگ پاجامہ
سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پہ گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی
میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا۔ کون ہے۔ میں نے کہا
کریم الدین استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ استاد نے اپنا نام سن کر کہا"
آئیے آئیے اندر تشریف لائیے میں نے آداب عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ بیٹھو
بھئی بیٹھو میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ کہا فرمائیے۔ کیسے تشریف
لانا ہوا۔ میں نے عرض کی کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پہ ایک مشاعرہ شروع کرنے
کا ہے۔ ۱۴۔ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی ازراہ بندہ نوازی قدم رنجہ
فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے کہنے لگے جائیے
جائیے کہاں [illegible] مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزا ا بے پالک کے
پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔ استاد

۱۔ ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب)، مرزا عبداللہ بیگ (باقی صفحہ ۱۷

نے کہا "بھئی حافظ ویران تمہاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو" حافظ ویران کہنے لگے "استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے" "وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں کل ہی کی بات ہے آپ کو ناٹوڑا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے۔ ان کی سات پشت کو تو م ڈالا" استاد ہنس کر فرمانے لگے "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلائیں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے سو کہے۔ میں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دیدیا ہے۔ ۵

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرہ میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرہ کی عزت بڑھائیں گے" یہ سنکر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاءاللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے بھئی۔ میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے" طرح کا جھگڑا ہی نکال دیا ہے۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف و قافیہ میں چاہے اگر غزل پڑھے "استاد" ہی تو، بہت خوب۔ بہت خوب کہتے رہے۔ مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل

بقیہ صفحہ ۱۶ کے بیٹے بغیر ہیں مگر انھوں نے ان کو پال لیا ہے۔ اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب و نسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے استاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں استرے کی بجائے تلوار دے ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔ ۱۲

نہیں گئے۔ یہ بڑبڑاتے رہے کہ اللہ خیر کرے دیکھئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشتقلے[۱] پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہے گئے ہیں تو اٹھ کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پہ تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ ایک مردانہ، دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا اونچی ہوئی ہے دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی (۵۰) سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رنگ آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں داڑھی بھری ہوئی ہے اگرچہ گھنی نہیں ہے سر منڈا ہوا اس پر سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ[۲] میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا بسلام کا

۱۔ معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مگر دہلی میں عام طور پر شگوفے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں ۱۲

۲۔ قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے اس سے یہ لباس لیا گیا ۱۲

جواب دیا۔ اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین خاں آ گئے۔ یہ امین الدولہ خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں ریختی میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس کی عمر ہے، انشاپردازی جغرافیہ، تاریخ، علم الانساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد اور بہت گورا اور رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی داڑھی، چھریرا بدن غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں، ایک بڑا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُنھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دو زانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے ہیں میاں نیر، تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں اصلاح دیتے ہوئے تھک جاتا ہوں، میری طرف دیکھ کر کہا۔ آپ استاد مولوی کریم الدین صاحب ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ فرمانے لگے، حضرت، آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کل ہی میاں عارف آ کر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیر، تم بھی چلو گے۔ نواب صاحب نے کہا، جہاں آپ وہاں میں آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ہمراہ ضرور ہوں گا۔ مرزا صاحب نے پوچھا مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے۔ مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو وہ آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے۔ ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔"

نواب علاؤالدین خاں علائی۔ نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں کوئی ۲۳-۲۴ سال کی عمر ہے متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی داڑھی لباس میں نملطے کا تنگ موری کا پائجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستینیں اور سر پر سیاہ، مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی، وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور کہا: "واقعی آج دیر ہوگئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہوں گے۔" میری طرف دیکھ کر کہا: "آپ کی تعریف" مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا: "بہت خوب آپ تشریف لیجائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں" جب یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا تو میں نے اجازت چاہی، وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انہوں نے مردانہ کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا تھا، جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا جما جمایا پایا کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے، راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں سر پر پٹے ہیں، بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنے اور سر پر چھوٹا سا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ میں رہتے ہیں، مجھ سے پوچھنے لگے: "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے پاس" پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں" حکیم آغا جان کے پھاٹک کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے دو طرفہ دو صحنچیاں ہیں اور

سامنے بڑے بڑے دالان در دالان کے پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی[۱] ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم، اور مرزا رحیم الدین حیا۔ مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ مسی آلودہ دانت ہلکی موچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر چوڑا سینہ لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگھریالے لمبے لمبے بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدن کا پائجامہ مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک بہ کا

۱؎ میں نے خود یہ مکان ۲۰-۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی "دست و بازو بشکست" ۱۲

پائجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں۔ کبھی لٹکی رہتی تھیں اور کبھی الٹ کر چڑھا لیتے تھے سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی اس کے کناروں پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولانا صہبائی دونوں پہنچے۔ تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم! تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں، دو ہوں آخر روز روز کی فرمائش کوئی کہاں تک پوری کرے۔" صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں، رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جو مجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں" حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لے کر کہا "بیٹھیے بیٹھیے۔" ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میاں حیا جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہو گی۔ میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہو گی۔ تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھا دیتا ہوں۔ اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں اور میاں سکھانند تم کیسے انتظار کرتے ہو میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک یورپ کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جانے گی۔ اس کا جوڑا آئے پر آئے۔" سکھانند حکیم تھے رقم تخلص کرتے تھے ادھرم پورے میں رہتے تھے، کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی۔ ریختی میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے، بڑے خوش پوشاک، خوش وضع۔ خوش اخلاق

ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سُنکر "بہت خوب بہت مناسب" کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کرکے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں؟" مولوی صہبائی نے کہا یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ یہ حکیم صاحب نے سنکر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے ہیں ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں[1] شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! بیان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ع

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہدہد کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں اور اپنے نااہل بچھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ ع

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں
ناخن قوس قزح شبہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں کہا ہے تو میں بیان نہیں کرسکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گذرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا

---

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا

نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب تو ان کی بات دوسری ہے
وہ بھی واہیات بکتے ہیں۔ مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں
کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے
میں نے عرض کی کہ۔ اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ
کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔" فرمایا ہر شخص مختار ہے، چاہے خود
آئے چاہے غزل بھیجے۔ میں نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک
بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر
آتا تو حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی
کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آ کر
ایک گٹھڑی مزدور کے سر پر سے اتاری اس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی گری
اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر
اس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلی گئیں۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہے
جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا۔ کہو میاں رقم
تم نے دیکھا۔" انھوں نے کہا "جی ہاں ایک خانہ کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی
میں نے جو اپنی۔ اے پر احمر رکھا تھا اس کی معافی چاہتا ہوں۔" کہنے لگے۔ اس کا خیال
نہ کرو انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا
تو صاف جواب ہے۔" میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں
تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا" مجھے تو اس مشاعرے
سے برائے نام تعلق ہے۔ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے۔

وہ بہت بیمار ہیں۔ اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی ان کی آخری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے" یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے ہیں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے افسوس ہے کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا" میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھا جی تم جاؤ میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے۔ اور کہا۔ "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا۔ تو عنایت ہوگی حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزاد اور شیفتہ تو واپس جاتے وقت راستہ میں ان سے کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا؟ اور طرح کیا ہے؟ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ طرح کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا۔ جس میں طرح نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلہ کی صورت نہ ہو شعر کہنے میں جی نہیں لگتا اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اور میں سلام

کرکے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک ٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جاکر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے۔ دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں کو ملا کر بنایا ہے صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرے کی شکل کا کر دیا۔ دالانوں کے سامنے دکھا چبوترہ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ اس پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر ۵۰ - ۵۷ سال کی تھی گداز جسم۔ سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھری ہوئی داڑھی، بہت سیدھی سادھی وضع کے آدمی ہیں ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، بدن میں سفید ایک برکا پائجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد

ل پرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہو تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے جہاں

دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پائجامہ۔ سفید کرتہ۔ نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پنجگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے۔ تقریباً ۳۹۔ ۴۰ سال کی عمر

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا: ہیں! خان صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے بھئی شیفتہ یہ کیا معاملہ ہے؟ یا خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔ میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا کہنے لگے۔ ہاں یوں کہو یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے۔ یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب حال بیان کیا تو ان کے آنسو نکل آئے کہنے لگے میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے

بقیہ صفحہ ۲۶ جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیے کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔ ۱۲

صفائی رنہیں ہے۔" میں نے کہا۔ نواب صاحب آپ کیا فرماتے ہیں اُن پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا صرف آپ کی وجہ سے انہوں نے یہ عہد توڑا ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔" میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے خیر۔ اس کو جانے دو اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟ میں نے کہا۔" جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔" فرمایا نہیں کبھی نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں تم نے آ کر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دوہری محنت پڑ جائے گی۔

(۳)
ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفدا کے ترجمہ میں ایسا گتھ گیا کہ ۷۔۸ روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلے تو کہیں رات کے سات آٹھ بجے جاکر گھر کی صورت دکھائی دیتی۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴ رجب کی شام کو ۱/۲ ۶ بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کہ میاں کریم الدین کون ہیں۔ کوئی کہتا کہ اس سے کیا کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا غازی کے حوض پہ آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگاکر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے۔ کٹورا نج رہا ہے مبارک النسا بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، جھمڑوں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا۔ صدر دروازے سے اندر کی

دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا: "واہ میاں عارف واہ تم نے تو کمال ہی کر دیا" کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان۔ اور کہاں یہ شاہی ٹھاٹھ۔ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔

چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے تختوں پر وری چاندنی کا فرش ہے اس پر قالینوں کا حاشیہ۔ نیچے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں۔ فانوسوں ہانڈیوں، دیوار گیریوں، قمقموں۔ چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے۔

---

۵ سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے اس سرے سے اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشئے سبز تھے کھنچی ہوئی تھی چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جچا ہوا تھا۔ جابجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دکان پر سے اٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیئے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان گلوریوں کو صافیوں میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک نہ پھولوں کی آ گئی تھی خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی ٹکتیاں، ان میں الائچیاں چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدان کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا میں تو الف لیلے کا ابوالحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی تھیں اس تماشہ میں تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے

---

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہ اسی پر اس مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے۔

پیے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ بہت رحم دل
خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دخل فصل نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں چڑھے
سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے" انہوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے شاعرے
میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب چلے نہ جائیں یہ اٹھنے کا نام نہ لیتے
ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔ لوگ
اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اٹھے ہاں گھڑی
گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا اور ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل
بھر گئے کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اٹھے مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں
سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دیکر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بیچارے
کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا۔ کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتہ
مجھے دیدے۔ اس کا جوتہ کیا تھا لیتھڑے تھے رہی گھسٹتے ہوئے چلے اپنا جوتہ بغل میں دبا لیا قلعہ پہنچکر
ایک نیا جوتہ نوکر کو دیدیا اور کہا: "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا کہ تمام عمر نہ بھولوں گا جب کبھی
تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس چلا آیا کیجیو" آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا اول تو اس
راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا مگر انہوں نے کبھی
"نا" نہیں کی۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا۔ اور
پوچھا۔ ہیں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے؟" میاں رحیم الدین حیا
ان کے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی
نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے نواب صاحب

وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آنے جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ ہے اکیا پڑھایا لکھایا، شاعر بنایا بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو در کنار مجھ کو باپ کہتے شرماتے ہیں ہاں بھی کیوں نہ ہو، تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بنارس کھچڑی تو مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان سرمایہ، دوسرے شماتت ہمسایہ، بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لی ہے۔" یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لیجا کر ایک جگہ بٹھا دیا ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شاہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لیے آ پہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیوں" کو نہ جانتا ہو جگت استاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ مگر استاد ذوق کے قلعہ میں قدم رکھتے ہی انکا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑ چکے تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مرتے دم تک مقابلہ سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی۔ کبر دہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے بلعم باعور تھے۔ لیکن غزل اس کر ڈاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے استاد ہوئے

---

۵ آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شاہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل ہی بادشاہ ہو جاؤں۔ اسی لیئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی، اور اسی طرح قسمیں کھایا کرتے تھے

رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ تک رسائی ہوگئی وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے اس لئے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے مصرعہ پر مصرع لگانے میں کمال تھا اور ایسی ترنج سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرع کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انھوں نے فوراً عرض کی :-

نامناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں

کسی نے وقت سحر گاہ "کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے صائب کا یہ شعر پڑھا

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔

دبلے پتلے آدمی تھے رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی جگہ لاکر بٹھا دیا۔ ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں۔ کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں ذہن بلا کا پایا ہے لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی۔ مشاعرہ میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے مزاج پرسی کی۔ کہنے لگے، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے۔ نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع

ہوتا ہے آپ بیٹھے تو سہی، خیر ایک کونہ میں جاکر بیٹھ گئے

اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لاکر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہ۔ شیفتہ صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے۔ کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں۔ اس لئے خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دیدینا ہے، کوئی چالیس سال کا سن ہے۔ رہنے والے نوتانوتے کے ہیں۔ مگر بدایوں سے دہلی میں آرہے ہیں، دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے، مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شرع اور تقوی کی وجہ سے چکمہ میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کو کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگا دی۔ ان کو بہت غصہ آیا۔ کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا[1]۔

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے گو نام نہیں لکھا مجھے یہ واقعہ انہی کی زبانی معلوم ہوا سنکر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا

مولوی صاحب میرے اُستاد تھے میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے ''میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے دہلی والوں کو بھی مات کر دیا سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے'' میں نے عرض کی مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا، یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے، فرمانے لگے تبھی یہ بھی اچھی ہوئی۔ وہ کہیں سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے۔ تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے۔ چلو من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے۔ نیر۔ علائی۔ سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے مصافحہ کیا اور کہا ''بھئی حکیم صاحب آج مجھ ناعر جان محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے خواجہ میر درد کے پوتے ہیں کہاں دلی کا چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یاران وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آ گئی ہے ابھی تک میاں عبد الرحیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہو گا۔ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے السلام علیکم کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا '' لیجیے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حاضر دیران صاحب آ گئے اور وہ آپ کے دوست جو کبھی ساتھ ہیں دیکھئے تو کس کے چہچہے مارتے ہیں۔ میاں یہ جن کا نام عبد الرحمن ہے، پندرہ برس کے رہنے والے ہیں دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے یہاں ٹھہرے ہیں ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں حکیم صاحب

ہی کے مشورے سے ہدہد تخلص اختیار کیا۔ انہی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھی۔ سر منڈا کر انگو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھسٹ بڈھے ہو گئے۔ انہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین شہپر الملک ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا مگر بعد میں انھوں نے استادانِ فن پر حملے شروع کئے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ ان کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لئے مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست کا لفظ سن کر مرزا نوشہ مسکرائے اور کہا بھئی میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا" ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہدہد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔ غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام مجمع ان کے ساتھ اٹھ گیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعے سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لیجاتے ہیں جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی کبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا

آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ داڑھی گلوں پہ ہلکی ٹھوڑی پر زیادہ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید کسی خاندان والوں میں ہو گی۔ امیر تیمور سے لے کر اس وقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا۔ مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجیے جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں ان کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے۔ اونچی چولی کا انگرکھا ہے نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پاجامہ ہے جنہوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا ان کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے۔ سر پہ چوگوشیہ ٹوپی، جسم پہ نیچی چولی کا انگرکھا

ؔ اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے انکی اس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے مرزا نوشہ کا ذکر تو چلتا ہی رہے گا، تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں انکی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی نہ تاتاری کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سے لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہا اس کے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گرجے کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی۔ اندر استر دیدیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جسکو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا اونچا ہوتا ہے۔ دمہ کے اوپر چار پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے کمرکی (کمرخ) کے نمونے کے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے وہ یہ کہ دمہ کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو جوڑ ان سے کسی قدر

اس کے اوپر مخمل یا پاجامہ دار کی خفتان پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک برکا پاجامہ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں انہوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیرباد کہدیا ہے چہرے کی ساخت سے انکو دہلی کا شہزادہ تو کہدو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

باقی حاشیہ صفحہ ۳۸ بڑھا دیا ہے اور انکے سلجھنے کے بعد جو بہل پیدا ہوئے ہیں انکو پھر کاٹ کر کلیاں ڈالدی ہیں اسطرح بجائے چاہبل کے ٹوپی کے آٹھ بہل ہو گئے ہیں خوبصورتی کیلئے ٹوپی کے کناروں پر پتلی لیس اور گوشوں کے کنارے پر باریک فیتون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جابجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے اس قسم کی ٹوپی کئی طرح بنی جاتی تھی قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں باقی لوگ انکو کسی قدر دبا لیتے ہیں جو ٹوپی آٹھ بہل کی ہوتی ہے اسکے پاکھوں کو اتنا دباتے ہیں کہ گوشہ دمہ کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آدھی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھول کو دبائے اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) ٹوپی کا بھی رواج ہے اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کے برابر سی لیا نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصہ میں چنٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا دہلی کی دو بلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں اس ٹوپی میں پانچ گوشہ ہوتے ہیں لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصہ میں ادسے ہوتے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگورے نیچے دمہ کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے یہ ٹوپی قالب پر چڑھا کر پہنی جاتی ہے قالب پر چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بہت استعمال تھا بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں اس ٹوپی کو بھی قالب پر چڑھا کر پہنتے ہیں لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لئے جسم کی خوبصورتی دکھانے کیلئے آستینیں بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کے آگے سے کاٹ کر الٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلہ سے بٹھانا بھی ایک فن ہے نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھادیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکایت نہ شکوہ۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ان کے خیال میں اسکو نہ بیٹھنا چاہیے تھا تو بجائے اسکے کہ اس کو وہاں سے اٹھاتے جو ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اسکو بٹھانا چاہتے تھوڑی دیر کے بعد کہتے ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا۔ وہ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کیلئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے تشریف رکھئے وہ جگہ خالی ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانہ سے اٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلہ سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد

باقی حاشیہ صفحہ ۳۹:- قلعہ والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے بہت تکلف کیا تو اسکے حاشیوں پر سمور لگالیا۔ نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جسکو عاشق معشوق یا چشمے کہتے ہیں اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں قلعہ میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے مگر شہر والے اس نیم کھلے آستین کو شیروانی کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال تکوسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "رخ چین" (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی بتی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے۔ مگر بہت کم۔ پاجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدن، غلطے، مشروع، موٹرے اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر کا پاجامہ پہنتے ہیں، مگر تنگ مہریوں کے پاجامے بھی چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جسکے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گرہ بھر لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے۔ تیل پلاتے۔ ہلدی مل کر بادہ چھجانہ میں لٹکاتے۔ یہاں تک کہ اسکی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلادیا ہے

ذوق خوب سمجھتے تھے اسلئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے صاحب عالم ادھر آئیے" کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے کہتے "بیٹھو بھئی بیٹھو غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعہ سے تھا۔ اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور ان کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعہ والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں ایک شاہزادہ صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنالیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ ٹھاٹھر میں اندازہ غلط نہ ہو تو لاکھوں ہی پدڑیاں ہیں جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ چھکڑے سے ایک بھی چھٹ کر نہیں جاتی۔ انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑیں انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آپہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرہ پر غضب کی نزاہت ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پہ سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم

باقی حاشیہ صفحہ ۴۰۔ جو نکلتا ہے اینٹھا ہوا نکلتا ہے جس کو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر بنے ہوئے ڈنڈ، شہر میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو۔ اور بانک بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے مقابلے ہوتے ہیں، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

میں سا سلیٹ کا انگرکھا۔ سبز گلبدن کا پاجامہ ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں انکی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے اور اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے، انکا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی اچکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لئے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار ان کے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لئے اس سلسلہ میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت ہے؟" سب نے کہا "بسم اللہ بسم اللہ" اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کیطرف نظر ڈالکر کہا "تشریف رکھئے" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ان کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ

۵۱؎ مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ نواب شمس الدین کے پھانسی پانے کے بعد انکی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے۔ نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا۔

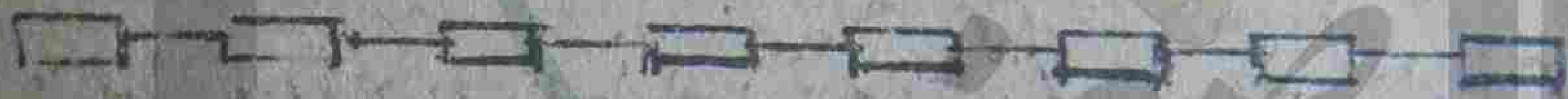
فاتحہ کو اٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے، فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا اے خوش نوایانِ چمنِ دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے استادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں، صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے، لیکن اس مشاعرہ میں، میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرہ کی ابتدا ہو گی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔ یہ کہکر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے بسم اللہ کہکر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعیں لیجا کر لگنوں میں رکھدیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا انہوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز بلند کہا حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا ہو گیا قلعہ والوں نے بٹیریں تھیلوں میں بند کر کے

---

۱۵ نواب فتح الملک بڑے کٹر مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ کے شروع نہ کرتے اسی لئے سب قلعہ والے ان کو "ملا" یا "ملیتا" کہا کرتے تھے۔

نگیوں کے پیچھے رکھدیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹادیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور بن دھنیے کی طشتریاں رکھا اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوے قلعہ سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

"حاضرین! حضرت ظل سبحانی، صاحب قرانِ ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جائے"



تکمیل

حضور شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے — چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطہ میں سے نکالی بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سروں میں پڑھنا شروع کیا الفاظ کی نشست زبان کی خوبی مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا کہ جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کا لطف لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب

کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزار دلوں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم

وہ نے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہے جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی، خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر ادھر ادھر دیکھا، ملوک العلی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "صاحب عالم ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہئے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے"۔ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا اس نے عرض کی "قبلہ دو عالم" میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہ عالی میں پہنچا دوں گا۔ خواص آداب کر کے جانے ہی والا تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ، چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی:۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے — مہربانی کی نشانی اور ہے

قصہ فرہاد و مجنوں اور تھا — عشق کی میرے کہانی اور ہے

روکنے سے کب مرے رکتے ہیں اشک　　بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے

ہم سے اے دارا وہ کب ہوتے ہیں صاف　　ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالبؔ اور مومنؔ بالکل چپ بیٹھے ہے۔ بعض قلعہ والوں کو برا بھی معلوم ہوا۔ مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں لا کر شامیانہ کے سامنے رکھدیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلہ میں کچھ پڑھنے کا دعوٰی کروں، البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا　　درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

حال کھل جائیں غیر کے سارے　　یہ کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر　　بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

وہ تو ملتا پر اے دل کم ظرف　　تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبان رقیب　　کھیل ٹھہرا کوئی گِلا نہ ہوا

تم رہو اور مجمع اغیار　　میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو　　رمزؔ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سنکر دل بے قابو

ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں شعر پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو انہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے لے لے کر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ صاحب عالم! سبحان اللہ! کیا کہنا ہے شعر ایسے کہتے ہیں۔ مزہ آ گیا"۔ استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانہ سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا کر سامنے کی صف میں میاں بل کے سامنے رکھ دی۔ نام تو ان کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں بل کہتا تھا۔ ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا[1] کہ کسی پہلوان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھوک کر آتے اور کسی کو جواب میں ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص بل رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں۔ ان کو اپنے شعر کہنے سے کام تھا غزل لکھی تھی۔

---

[1] اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھا دیا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آ کر خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گزرا۔ شیخوں والوں کے استاد حاجی علی نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا مگر داؤں پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں بل نے حسب معمول شیخوں والوں کے ہاں آ کر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اتار پینترا بدل کر سامنے آ گیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں بل کو ہنسی آ گئی کہ بھلا یہ پونا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا استاد علی جان نے کہا "کیوں بھی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے؟" یا تو ہاتھ ملا دو یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آ کر خم نہ ٹھونکنا

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آتے جنگ سے ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے
دل اب کے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں نکلے یہ کیونکہ دیکھئے قیدِ فرنگ سے
آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا یاری تو تم نے کی ہے تِل اس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہونے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا میرزا علی بیگ کے سامنے رکھ دی۔ یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ اِدھر شمع رکھی گئی۔ اُدھر نواب زین العابدین خاں نے آوازہ دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً گہرے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا۔ ایک پلو کا بکل مارا۔ دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑا لڑا کر اور اڑا اڑا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ زٹ ایسا پیدا کرتے کہ کوئی ڈیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا گیا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، قلعے والوں کو

بقیہ صفحہ ۴۸ کہنے لگے استاد! جوڑ تو دیکھ لو۔ خواہ مخواہ لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟ استاد نے کہا "میاں جو جیسی کریگا ویسی بھریگا۔ دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا، یہی ہوگا نا کہ ہڈی پسلی تڑوا کر آئندہ کو کان ہو جائیں گے۔

بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے۔ اور تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس مشاعرہ کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے۔ دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں "یل" کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگئے پہن، چادریں پھینک دنگل میں اترے۔ اترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا۔ دو چار ڈھکیلیاں کھائیں، کچھ بڑھ کر مٹی سینہ پہ ڈالی اور خم ٹھونک کر آمنے سامنے آ گئے۔ دونوں کے جسموں میں

تو اس غزل میں بڑا مزا آیا مگر جو ریختی کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی:۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا
بوا ہم عورتوں میں ہے بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو
نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں تاکا تو اب تاکا

اگر اے ناز میں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے
چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دولہا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلی صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر الٹی طرف کا (صفحہ ۵۲ پر ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت، پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرہ کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آ جائیگا۔ ناز نین کے پڑھنے کے بعد اُدھر جانب کی شمع ہشکر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بچارے ایک مرد درپیشہ آدمی ہیں لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، کسی کے شاگرد ہیں کسی کے اُستاد، شعر خاصا اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا کہ سبحان اللہ لکھا ہے:۔

غلط تو ہی نہ میرا اے بت خونخوار دشمن ہے
ترے کوچہ میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبد اللہ خاں اوج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پرانے چالیس پینتالیس برس کے مشاق شاعر ہیں مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کھپا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے۔ کوئی کیا داد دے ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی مزا لیتے ہیں اور خود ہی

بقیہ صفحہ ۴۹۔ زمین آسمان کا فرق تھا کہ بھی ادھر چوٹی کا مقابلہ تھا تمام جنگل میں سناٹا تھا، سوئی بھی گرے تو آواز سُن لو بالی آواز تھی تو یا لی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں مٹھل آگے لونڈے کا ہاتھ پکڑا جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آ گئے۔ وہ پٹ خطہ مارا، انھوں کو پیر کر نکل گیا۔ انھوں نے اس کا سید ھا ہاتھ پکڑ کر دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ کاٹو روی کرتے اس داؤ پا لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اس کو دبا ہی بیٹھے، وہ چپکا پڑا رہا۔ انھوں نے ہتے کس لئے۔ تھوڑی دیر تک اس کو خوب رگڑا۔ وہ سہے چلا گیا۔ انھوں نے بغلوں میں دس کر اس کا سینہ کھولنا چاہا، وہ بھی موقع تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اُس نے ٹانگ باندھ جو اڑا دیا تو میاں بل چار دل نما نے چت جا پڑے لونڈا اُچک کر سینہ پر سوار ہو گیا۔ وہ مارا، وہ مارا کی آوازوں سے جنگل ہل

اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زیر ہیں آ کر صف مجلس سے گرد ل آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں۔ مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتا ہے جو ان کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انہوں نے شعر پڑھا ادھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا تھا۔ چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی ہے جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔ ۵

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا ۔۔۔ بے پل صراط اتریں یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سرا سے نفرت ۔۔۔ سم ہیں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل ۔۔۔ سہانچے ہیں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ موڑتا ہوں ۔۔۔ (رکھ کے) دیوی کے آستاں پہ میں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اچھل پڑے۔ کہنے لگے۔ واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعہ نے تو غضب ڈھا دیا ہے۔ بھئی واللہ الفاظ "رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ غرض سب استادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کپ ؛

بقیہ صفحہ ۵: لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں "پل" کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اٹھ، چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی، دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لئے دہلی سے گئے۔ بڑے غیرت مند تھے، وہ دن اور آج کا دن، پھر ان کی صورت نظر نہ آئی خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔ +

۱۴ رجب سنہ ۱۲۶۱ کے مشاعرے میں شعرا کی نشست کا نقشہ

اس نقشہ سے نشست کی کیفیت اور پڑھنے والوں کا سلسلہ سمجھ میں آجائیگا

سالک	بیتاب	حضور	برق	میر عباس	شور	آزاد	تاب	تسکین	تشنہ

سالک	ملال	رخشاں	عارف	عیش	مبتلا	[illegible]	آزردہ	مومن	غالب	رمز	ذوق	احسان	داغ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	آغا	حشمت

حشمت	اشکی	فسوں	ماہر	نالاں	تسلی	شوق	بیدل	بسمل	

تشنہ	جوش	حیرت	عزیز	[illegible]	[illegible]	اوج	[illegible]	[illegible]	عاشق	[illegible]		نازنین	اوج	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	بسمل

ہوے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف "تمکین" کے سامنے آئی۔ ان کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی، مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ سانولا رنگ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔ غزل کہی تھی:

دوزخ بھی جس سے مانگتی ہر دم پناہ تھی — کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہو ترا اے عشق بے حیا — آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا استاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کیے جاؤ۔ ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ بے استاد رہے تو بھٹک نکلو گے۔" میاں تمکین نے مسکرا کر کہا: "استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں۔ کل ہی انشاء اللہ استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں" استاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بتن بھی کہتے ہیں۔" الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے، بعد میں ان سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آ ملے۔ بھاری بدن منڈی ہوئی ڈاڑھی چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ

دهری کا پاجامہ، اوپر سوسی ہی کا کرتہ، کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پہ سوزنی کے کام کی گول ٹوپی، بیچارے نیچہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لئے جو کچھ کہتے ہیں دل و دماغ ہی میں ٹھونستے جاتے ہیں یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک امی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی۔ ع

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچئے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبِ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی، غزل تمام ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا، "خاں صاحب یہ میاں بن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں، کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں، مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بن کیا شعر تھا" میاں بن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آگیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آگئی — پہلو سے دل میں دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور شعر تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی
لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آلگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں بن! یہ خدا کی دین ہے، یہ بات پڑھنے یا پڑھانے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو اس وقت دل خوش کر دیا

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں بہت دنوں سے دلی میں آ رہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دلی لگاؤ ہے کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے۔ وہی لکھتا ہوں

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے
توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں

دل میں خوش ہیں علو پر اے تابش
وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منھ سے بیساختہ واہ واہ نکلی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں۔ عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں کوئی تیس برس کی عمر ہے بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر پڑا کر دیا، ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں، لکھا تھا،

جام شراب سے خم کو بھر دوں تو بن گیا
ساقی بنا دے ماہ پیالہ اچھال کے

ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو
جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع[1] منشی محمود جان اوج کے سامنے گئی، ان کی غزل میں دو ہی شعر

---

[1] آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا الٹی جانب سے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے داہنی طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔ ۱۲

ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی۔ باقی تو سب بھرتی کے تھے

آنے میں اس جانِ جاں کے دیر ہے
کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے

ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں
موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا کامل کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں کامل تخلص کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں بھی اوچی بنکر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے دیکھو تو مضمون میں بھی فری سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے انکی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں۔

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے
یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جسوقت ہوے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں۔ ۶۳-۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے منھ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے۔ آپ خود ہی انکا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پہ
رحم اے فتنہ گر نہیں آتا

تیرے بیمار کا ہے یہ عالم
ہوش دو دو پہر نہیں آتا

وعدہ شام تو کیا لیکن
کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لئے ذرا آزردہ ہو گئے۔

ان کے بعد شمع میر حسین تجلّی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے زبان پر جان دیتے ہیں غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔ مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم — یہ سر، یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے — کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلّی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پہ دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے — ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملتی ہے — گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے — نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اس کی انھوں نے بہت تعریف کی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا ”میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کر دیا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔“

شمع کا شیخ نیاز احمد جوشش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے جوشش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں، انکی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے، مگر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی۔ ہاں قلعہ والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پہ

اُٹھالیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگردوں کا دل بڑھایا۔ غزل
دیکھ لیجئے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدہ میں کیوں پڑا ہے ارے اُٹھ شراب پی
اے جوشؔ میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔
ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا یہ عزیزؔ تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا — جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا — منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہی سر — اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا — اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورتِ نیاز یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہنے گا ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا، بھئی صہبا تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحب زادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو۔ ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میاں عزیز نے اُٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی، ان کا کیا کہنا۔ سرکار سے خطاب خانی پایا ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، کبھی کسی کے، پہلے احسان سے تلمذ تھا۔ آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا میرا دل بڑا خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہوں گے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں نو آسماں ہیں، دو بھی نہیں، چار بھی نہیں

ہے کس کو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے لب پر ہمارے تذکرہ یار بھی نہیں

جتنا فراق یار میں وعدے کی لاگ پر
آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰۔ ۳۲ برس کی عمر

بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی باٹ دار آواز ہے۔ پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں ہر شعر قابل تعریف تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن، دو دن، کہاں تک، تو بھی تو انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ ہیں
خاک کا پُتلا بنا پُتلے سے انساں ہو گیا
کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بندِ نقاب
اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعوائے خدائی اس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پہ جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں۔ رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے "واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا" شعر کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے۔ سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بُت کافر کو تھا، کچھ درستی پہ جو آج آیا تو انساں ہو گیا۔

غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سُناتے، مزے لے کر جھومتے

اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے ۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش خاں تنویر کے سامنے آگئی یہ نوجوان آدمی ہیں ۔ کوئی بتیس تینتیس برس کے ہوں گے ۔ بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں ۔ میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی ۔ غزل بھی معمولی تھی، صرف یہ قطعہ خاصہ تھا ۔



قطعہ

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپِ غم
کہتا لوگوں سے بظاہر بتِ عیار ہے کیا

رنگِ رُخ زرد ہے تر چشم ہے لب پر دمِ سرد
پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی ۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضع دار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں ۔ ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے ۔

سبو سے منہ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کس کو؟
کہ بھرلے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے :-

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں
اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل

جل جل کے آخر تپشِ غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا ہے پہلو میں جائے دل

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سُنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

اسکے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون ؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء، نظام الدین ممنونؔ کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منتؔ کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل یہ تھی :-

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ
ناخدا ترس تو کعبہ میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر
نازِ ہر گل نہ اُٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اُٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سُبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہؔ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوب دار نے شمع سامنے رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی، اور

کہا میں بھی کچھ عرض کروں ۔ سب نے کہا "ضرور فرمائیے" انھوں نے نہایت آزادانہ لہجہ میں بھی کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سُنائی :-

غزل

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے　　سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی　　رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے　　فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش　　سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا ۔ ایک سنّاٹا تھا کہ آسمان تک چھایا ہوا تھا۔

غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

اُدھر یہ عالم طاری تھا، اِدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے ۔ ان کی "کچھ نہیں، کچھ نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی ۔ جب

ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجئے۔"

شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نومشق ہیں۔ مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں۔ دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا۔

غزل ملاحظہ ہو:-

دل تو نے ہم سے او بت کافر اُٹھا لیا
اس ناز کی پہ بوجھ یہ کیونکر اُٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا
کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اُٹھا لیا
پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر
شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اُٹھا لیا

بہر حال کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا۔

کچھ تھوڑی بہت دیر تعریف ہوئی، اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔

ان کی کوئی چالیس برس کی عمر ہوگی۔

صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے۔ انہی کے دادا امیر احید ر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا۔ سپاہی آدمی ہیں شعر بھی برا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

1 ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
2 شب وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے
3 وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے
4 مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغاز عشق میں تسکیں
5 کہ سوجتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا۔ اور لوگ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔ استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی انہوں نے یہ غزل پڑھی

نگہ کی چشم کی، زلف دوتا کی — ہے اک دل جفا کس کس بلا کی
کہاں اس گل کی کلی تک جا سکے ہے — ہوا باندھی ہے جادوں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل — تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل ایسی ہی لکھی تھی بھلا اس کی تعریف کون کرتا۔ ہاں اس کے بعد یہ غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آ گیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل لکھی ہے

پھر کتاں دار جگر چاک ہوا — پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اس بت کو مشابہ کس کے — دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ — آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریف کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بیچارے بڈھے آدمی ہیں شاہ نصیر کے شاگرد ہیں مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پہ یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا باقی اللہ خیر سلا لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب اور مومن، آزردہ صہبائی غرض جتنے استاد ان فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے۔ ہر یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انہوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا: "دیکھا شعر یوں کہتے ہیں" وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے۔ ان کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر انہوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈرلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں دلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانہ کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی ۷۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں شعر و سخن کا بہت شوق ہے عارف کے شاگرد ہیں جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دلی میں آ موجود ہوئے لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات

جیت اردو میں کرتے ہیں ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ برے نہیں ہوتے ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے غزل ملاحظہ ہو ؎

وہ گرم رو راہِ معاصی ہوں جہاں میں / گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی / ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی بیچارے غریب صورت فرسودہ لباس کوئی ۶۵-۶۶ برس کے آدمی ہیں شاہ نصیر کے بڑے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر کے قدم شریف میں جا رہے ہیں مشاعرے کی کشش کبھی کبھی ان کو دہلی کھینچ لاتی ہے پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں ؎

کیسی ٹھوکر جڑے ہے حضرتِ دل / پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ق / تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں / خیر ہے کچھ پرے ہٹو تو سہی
غیر کی کل وہ لگ کے چھاتی سے / مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی
اس لئے اس کے ہم گلے سے لگے / کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر چکر آنے لگے تھے۔ اور برے بھلے کی تمیز دشوار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہو گئیں نہ کسی نے شوق سے سنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی یہ کوئل کے رہنے والے ہیں، قوم کے عیسائی ہیں۔ اور جانسن نام ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل ؎

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض / دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی

بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا
ورنہ یہ زیست مرگ کے اپنے گواہ تھی

دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا
جس طرف سر جھکا دیا بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیف کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھو۔ یہ شعر وہی باوا آدم کے وقت کے کہتے ہیں

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے
شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے

وہ بد گماں ہوں کہ اُس بت کے سایہ پڑے جو
رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے پیکوں سے آنکھیں مل ڈالیں۔ بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ ڈالیں۔ بعض اُٹھ اور پانی کا چھپکا منھ پر مار آئے۔ بھئی نیند اور کہاں کا سونا، میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی پہلو بدلا۔ استادان فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب کی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا: "میر صاحب یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ تو یہیں کر پڑھئے"۔ یہ کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دو شمعیں اُٹھا کر وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ، شامیانہ کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کون سا مشاعرہ ہے جو ان کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا۔ کون سی محفل ہے جہاں ان کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں، ہم نے تو جب سنا ان کا نام میر صاحب ہی سنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔ بڑے سوکھے سے آدمی ہیں۔ غلافی آنکھیں، طوطے کی سی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، ٹھیا سا سر، خشخاشی بال۔ گوری رنگت، اونچا قد، غرض ان کے حلیے کو دہلی کے کسی بچہ سے بھی پوچھئے تو پورا پتہ دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک بر کا پاجامہ، سفید کرتا، اس پر

سفید انگرکھا، سر پر ارخچین کی ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جاتے۔ اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب بھی ہو گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انہوں نے کبھی برا مانا نہ ان کا جواب دینے میں ان سے رکتے نہ ان سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا جو کچھ کہنا ہو نہایت اطمینان سے شعر میں بیان کرنا شروع کیا بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو گئی یہ بھلا کب دبنے والی آسامی تھے، چوکھیا اٹھتے جب زبان سے نہ دبا سکے تو زور میں آ کر کھڑے ہو جاتے یہ کھڑے ہوئے اور کسی نے ان کو بٹھا دیا۔ معترض کو ڈانٹا، میر صاحب کا دل بڑھایا۔ اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا[1]

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا

۱؎ غدر کے بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کئے گئے تذکروں میں تو ان بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔ ۱۲

حضرات میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔" اپنے منہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں۔ اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہدہد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمایئے۔" میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے چہیتے اور انہی کے بل بوتے پر پھدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے۔ تو جواب بھی دیا جائے بھلا میر صاحب کو بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے، اور تو کچھ بن نہ پڑا، میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا۔ "ہجو مثنوی کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا ہیں! میر صاحب یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل کر دیا، پڑھیے میر صاحب! خدا کے لئے پڑھیے سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائے گا زبان ادھوری رہ جائے گی۔ میر صاحب نے کہا نا بھئی نا میاں ہدہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے منہ پر کہتے ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہو تو یہ غیبت ہے اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انہوں نے بھی اس ہجو او [illegible] چند [illegible] خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا خدا ہی بہتر جانتا ہے بس

اتنا معلوم ہوا کہ تیر، پیر، دستگیر، قافیہ "ہے" ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھا اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزہ آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرع کو کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا، مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا"۔ میر صاحب نے کہا مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے، مطول[1] جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں مولوی صاحب بڑے چکرائے، کہنے لگے "میر صاحب! بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ، مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں"۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا "مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں"۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے کہنے لگے "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں کل ہی اس کی بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے پر لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرع ختم ہوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا"۔ مرزا نوشہ نے کہا، "میر صاحب

---

[1] علم معانی و بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور کتاب کا نام مطول ہے۔

آپ سچ فرماتے ہیں، ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھئے میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہیں، اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے یہ یہ بڑی یہ یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحرِ طویل کے بیس بار مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحرِ طویل میں نہیں رہا رباعی کی بحر میں آ گیا ہے۔" میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا، "واہ مرزا صاحب چلتے چلتے آپ بھی کھٹک گئے، رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بتلائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں؟" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھئے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرہ کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا، "حضرات غزل ختم ہوئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی تو مقطع آیا ہی نہیں، اب بے مقطع کی یہ کیسی غزل؟" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے کہ یہ غزل میری ہے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔" یہ کہتے کہتے انہوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی رح علیہ کی ایک مشہور تصنیف ہے جسکو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا ہے۔

ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بر ٹھکو بیٹھی ہے لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پہ اب اے شیخ
قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا

ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ
تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا

اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں
ایک پارسا سنا ہے کہ میخوارہ ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اتار دیا تھا۔ اس لئے اس غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں کوئی ۲۰-۲۲ برس کی عمر ہے۔ سر پہ لمبے لمبے بال، سانولی رنگت اس میں سرخی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہہ صورت، سفید غرارہ دار پائجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج اور نہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے، آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے۔ غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ! واہ۔ کہتے ہیں۔

بزم اغیار سے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو، تو ہی تو ہو جائے

کچھ مزا ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا
چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندہ خاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

آپ انکار کریں وصل سے میں در گزرا
کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے

ہو نہ ہو بس ہیں کوئی۔ کچھ نہیں اس کی پروا
دل بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے"

تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور استادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے خود پڑھتے اور مزے لیتے۔

ابھی ابھی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسیوں کے سامنے رکھی گئی یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور ظل سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دل مضطر کے تیر کا
باہر ہمارے پہلو کے سوفار ہی نہیں

کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے
ظاہر ہیں تو اہی ہیں بیمار ہی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں نگینے جڑ دیئے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید لباس بغل میں انگوچھا کندھوں پر سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے ہی جایئے۔ شمع سامنے آئی تو انہوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا۔ سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انہوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش۔ نہ ہاتھوں میں طاقت
جو اٹھ کھینچیں دامن، ہم اُس دلربا کا

سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے
کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے۔ مگر پاؤں نے یاری نہ کی۔ لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اُٹھائے۔ مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی اٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بیدست و پا

سرراہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منھ سے تعریف کے بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بے دست و پا کا" استاد ذوق نے کہا "استاد! یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد ہی جیسا استاد چاہیے"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سنتا، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوش، نقہ صورت آدمی ہیں، پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف — کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی — معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علیخاں بیتاب کے سامنے آئی ۳۰، ۳۲ کا سن ہوگا رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انہی کے ساتھ مشاعرے میں آگئے تھے بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو اچھی نہ تھی، مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی بیتاب کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ، ہائے لکھا ہے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ — ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو مے سے کام ہے
بیتاب پی خدا نے تجھے بھی دئے ہیں ہاتھ — یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخر الدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا

نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا۔ شہزادے تھے، اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں، خوش ہو گئے، غزل یہ تھی:۔

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن — یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے — مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر ہو گا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون سا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی؟ اور کون سا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا، جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لے گا، چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی، کلوں پہ کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال، کوئی تیئس سال کی عمر بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں، ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید ٹھپے کا رومال، شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستینیں الٹیں، ٹوپی کو اچھی طرح جمایا، اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا، ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے" مرزا فخرو نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو آخر اس میں

اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا۔ ایک بار سنبھل کر کہا "عرض کیا ہے"

انتہا صبر آزمائی کی
ہے درازی شبِ جُدائی کی

ہے بُرائی نصیب کی کہ مجھے
تم سے اُمید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے
داستاں اپنی جبہ سائی کی

ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں
پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا نہ کرتا وصال شادیٔ مرگ
تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی

راز کھلتے گئے مرے سب پہ
جس قدر اس نے خود نمائی کی

کتنے عاجز ہیں سمجھے جاتے ہیں
بندے بندے ہیں بُو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک
آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پہ یہ عالم تھا کہ محفل لوٹی جاتی تھی ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوئیں۔ اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ اُستاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جبہ سائی باندھتے

آئے ہیں، تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا، کیا کلام ہے۔ کیا روانی ہے سبحان اللہ، حکیم مومن خاں نے کہا: میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔" میاں سالک نے جواب دیا، استاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا، دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑوں بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا۔

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴ - ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں۔ مگر پھیکے، ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بتخانے میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا
اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا

ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا
پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہیں تھا

توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں
ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں ان کے گانے میں مزا آگیا گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے۔ مگر استادان فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاؤالدین خان علائی کے سامنے آئی۔ انہوں نے بہت اونچی آواز میں غزل سنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں ابھی نوعمر ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔ غزل دیکھو تو استاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگانِ گلکدۂ آرزو و آرزو
حاشا اگر تمہیں سرِ سیر و فراغ ہے

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشمِ دل
کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

وہ گل جو آج ہے قدح موج خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے

گل جور کل ہے سنگِ جفائے سپہر سے
گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے

اور لالہ تند باد حوادث سے خاک و خوں
گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے

جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے

مغرور جاہ سے یہ کہو تم علائیا
کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزا۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی، تعقیدوں سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

باز آ ستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں
کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں

گو نزع میں ہوں میں ترے بن اے جان من
کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں۔ اُردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا:-

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنی باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

ترے غصہ سے ایک دم میں گیا
مردہ نہ ہزار سال ہمیں

طالع بد سے نیّرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے، شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پہلے احسان کے شاگرد تھے اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی۔ لکھا تھا۔

بسانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت ہے   کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا

نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، گر ہم   یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا

گندھی تھی کون سے بدمستِ تشنہ لب کی وہ خاک   کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا

بذوقِ یار کو دے رخصتِ جفا کہ یہاں   ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا

ہیں ایک وہ بھی کہ کم سے ہے جن کو راز و نیاز   اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرع کو پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آہی گیا۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا۔ وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں   پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے کا ڈر نہیں   خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں

بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں   اپنے ہی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ استاد احسان نے کہا "میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں، لاکھوں شعر سنے، لاکھوں سنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا" میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف

مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں۔ احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے — حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے
کعبہ تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ — دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے
جنس دزدیدہ کی مانند ہے الجھاؤ میں جان — کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے
رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کی ہاں — کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار سب مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں، زیورِ علم سے آراستہ اور کمال سے پیراستہ صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ میانہ قد خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہُدہُد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اس کی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا لیکن جب اس نے اُستادوں پر حملے شروع کیے اس وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی ملوک العلی نے کہا، حکیم صاحب شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں پھر آپ نے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا۔ مومن خاں نے کہا بھئی مجھے تو اس قطعہ کے تیسرے مصرع میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکہ کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے بدہد کے مقابلے میں جو اعلانِ جنگ کیا تھا وہ سُن چکے تھے۔ اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی۔ اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی۔

صلح اُن سے ہمیں کئے ہی بنی   دل پہ جھگڑا تھا دل دیئے ہی بنی

زہد و تقوے دھرے رہے سارے   ہاتھ سے اس کے مے پیے ہی بنی

لائے وہ ساتھ غیر کو، ناچار   پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی

کس کا تھا پاس شوقِ ظلم اے عیش   ان جفاؤں پہ بھی جیئے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلِّ علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبارِ کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ ان کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں بدہد کچھ چڑک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا اُنھوں نے پہلے ہی اس بکھیرو کی زبان بند کر دی۔ خیر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں۔ جن کی تعریف مشاعرہ میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی پینتیس چھتیس سال کی عمر ہے اکثر بنارس میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر ڈاڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اب اپنا کلام اُستاد ذوق کو دکھاتے ہیں، شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں۔ پہلے حکیم اشرف علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ، شاعر بھی اچھے ہیں۔ مگر محنت نہیں کرتے۔ زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے
رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہو چکا وصل وقتِ رخصت ہے
اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگِ کوس رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں، مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا۔ میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے۔ اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے۔ حیا نے جواب دیا۔ جی نہیں قبلہ، میں نے تو اُستاد ذوق کی تقلید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ع

"سینہ میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"

بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعہ میں سانس مذکر ہے یا مؤنث؟" بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں، ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں۔ مگر خود ان کا کلام، تمام و کمال فارسی ہے میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی اور مشاعرہ میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے۔ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را از فارغ ز عالم ساختم | محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
ہر دم دو در چشم مردم عالمے تاریک گشت | من نگر شمع چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمتِ دیدار اوست | جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد جور و من از ہجرِ دوست | داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد | مَے ز خونِ دل کشیدم خویش ایجم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ منہ دیکھا کئے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرہ میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہا ہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سنئے ابھی ۳۰، ۳۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ اُستاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے قدخا...

---

[1] قلعہ والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا ہے۔

اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی، مگر روشن، گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹھے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پاجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے، ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
ہے پابند دلوں کے دل میں رہنا قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے غضب ہے بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ ہر شعر پر یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہوں گے، جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی، ان کا کیا کہنا، استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں، مگر خود استاد ہیں۔ انھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی، یہ سن کر ذرا خاموش ہوئے، اور شعر دوسروں کی نظروں

سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کی ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر اُدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا۔ اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے
جوں آفتاب روشنیِ آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجہ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز
ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں، مگر جب اُستادوں کے پڑھنے کی نوبت آئی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے، اُستادوں کے انہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی تعریف کے قابل ہوں اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کر دی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور نہ ہی داد بھی دیتے ہیں۔ مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے

کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے یہ غزلیں کسی طرح اُستاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

ان کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہوں گے ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لے کر ی تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ، خدا بہتر جانتا ہے خود انھوں نے اپنے خیالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں وہ نقل کرتا ہوں۔ قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و مومن — ہوئی احساں سے پر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض — طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب — اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جنکے تمام — مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا — کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پہ ان کو اُستاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ۔ مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں۔ مگر سارا شہر ان کو اُستاد مانتا ہے، ہوں گے۔ ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی۔

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجابِ دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں میں تو اس لبِ میگوں کے سامنے — نامِ شراب لے کے گنہگار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہِ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہِ رُخِ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کردہ گنہگار ہو گیا

اس کی گلی میں آن کے کیا کیا اُٹھائے رنج　　خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطعِ تعلق ہوا نصیب　　قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد ہیں جید عالم ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز ذرا نیچی ہے۔ لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں، ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے۔

باتوں سے میری کب تہ و بالا جہاں نہیں　　کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند　　کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
شب اس کو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح　　ہیں لب تو کیا، نگہہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق　　شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ　　کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلا اس کے روبرو　　مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب چیز ہے

مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انھوں نے غزل ہی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہوگئے۔ ۱۷-۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں — ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی — شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں — وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے مے کشوں سے لطفِ شراب — یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرت خضر جب شہید نہ ہوں — لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھالی شکل ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہوگیا ہو۔ اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے

الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہوگئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا۔ اور اس ریختہ کے اُستاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُنھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی دردانگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

ناںگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اِک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اس کے پڑھتے وقت ان کی اُنگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو اُنگلیوں میں بل دے کر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے۔ اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعراء نے تعریف کی۔ سُن کر مسکرائے اور کہا۔ آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ
تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ان کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو پچھلی سی بدل کچھ کے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے

دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی۔ کہ جس کو انھوں نے متوجہ کیا۔ اس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی استادی کی داد دینی چاہیے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں :-

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دل محزوں — نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رُلائے خدا

بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دوگے جواب — خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا

رضا یہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف — جو اس پہ تو نہیں راضی، تو ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچہ میں کہتا تھا کل یہی احساں — یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے۔ تو مرزا غالب کی باری آئی۔ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے۔ "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہہ کر ایسے دلکش اور موثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور رسیلی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے۔ اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ غزل تھی :-

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

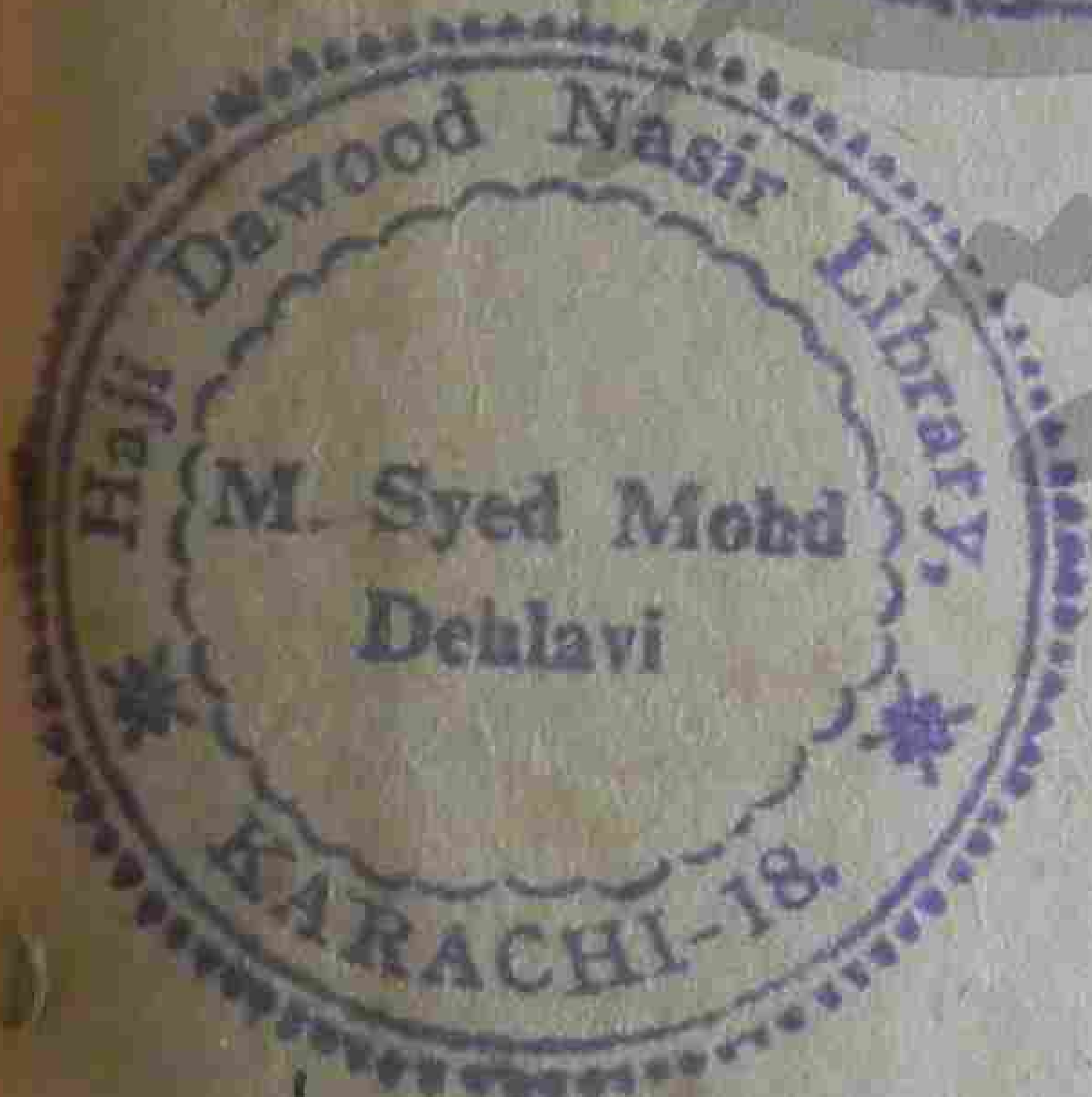
غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے۔ مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا۔ صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہوگئی۔ شب ہجر کا مزہ آگیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہوگیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ مرزا فخرو نے کہا۔ استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے، غزل پڑھیے۔ رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے، قطعہ پڑھیے، غرض جو دل چاہے پڑھیے ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور۔ استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کی آواز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردہ میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یٰسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یُمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

موذن مرحبا بروقت بولا ۔۔۔ تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی آواز آئی۔ "اللہُ اکبر، اللہُ اکبر، اللہُ اکبر، اللہُ اکبر"! اس کے ساتھ ہی سب کے مُنہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے" اذاں ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا۔ صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آئی تھیں۔ بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی کہ "حضرات مشاعرہ ختم ہوا"۔





ختم

نگار اکیڈمی رضن تالاب گوالی لین نمبر ۳ اردو منزل
کراچی
پاکستان

سول ایجنٹ

محراب ادب

فریر روڈ

کراچی